جامعہ ملیہ اسلامیہ
ایک تعلیمی تحریک

جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے جس ادارے کی بنیاد ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کی مسجد میں رکھی تھی اس کا تخیل لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھا' یعنی ایک ایسے ادارے کا تخیل جس میں جدید علوم مادری زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں' جس کا نصاب علم اور مذہب کا سنگم ہو' جو تعلیمی اعتبار سے آزاد اور خود مختار ہو اور جس کے طلبہ فارغ التحصیل بن کر محض سرکاری ملازمتوں کا سہارا نہ لیں۔ سرسید نے بھی کچھ اسی قسم کی تعلیم کا خواب دیکھا تھا۔ سید محمود کے ہائی کورٹ کے جج ہونے پر وہ اکثر کہتے: "میرا جو اصلی مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے کتنی ہی ترقی کریں' مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی"۔۱۔ درحقیقت سرسید کا مقصد "نہایت اعلیٰ و ارفع تھا"۔۲ اور جو لوگ ان کی اسکیم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سرسید کیا چاہتے تھے۔

جب برٹش گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو رد کر دیا کہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی آل انڈیا یونیورسٹی ہو جس سے ملک کے دوسرے ادارے خصوصاً مسلمانوں کے کالجوں اور اسکولوں کا الحاق ہو سکے تو وقار الملک نے جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ اب علی گڑھ کا ایم۔اے۔او کالج ایک ایسی یونیورسٹی نہیں بن سکتا جس کے ذریعہ سے قومی تعلیمات کا انتظام کیا جاسکے' اس لیے ایک جامعہ اسلامیہ یعنی قومی دارالعلوم قائم کیا جائے اور وہ سرمایہ جو مسلم یونیورسٹی کے لیے جمع ہو رہا ہے یا ہو سکا ہے وہ جامعہ اسلامیہ کے سپرد کر دیا جائے۔

وقار الملک نے تعلیم کے نظام و نصاب کا جو خاکہ پیش کیا تھا اس میں مسلمانان ہند کے ان گروہوں کے واسطے بھی جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں تھے' تعلیم کا انتظام کرنا مقصود تھا تاکہ مسلمانوں میں تمام ضروری علوم و فنون کی تعلیم کا عام چرچا ہو سکے۔۳ یہ علوم و فنون اردو زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں گے اور "علیٰ قدر مدارج و ضرورت انگریزی زبان کی تعلیم کا اہتمام (بھی) درکار ہوگا"۔۴

وقار الملک نے یہ بھی لکھا تھا کہ "دینیات کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ میں ہر قسم کی

تعلیم کا انتظام موجود ہو جس سے ایسے روشن ضمیر مفسر، محدث، و فقیہ، ادیب اور متکلمین پیدا ہوسکیں جو ایک طرف اسلام کی خوبیوں اور صداقتوں کا سکہ غیر مذہب کے لوگوں کے دلوں پر بٹھائیں، اور اشاعت اسلام کا کام کریں اور فیضان صحبت سے طلبہ کے دلوں میں نور ایمان و اسلام کو پیدا کریں اور ترقی دیں"۔۵

ایم۔ اے۔ او کالج سرسید کے خواب کی ادھوری تعبیر تھی، ان کا نصب العین دراصل ایک "آزاد محمڈن یونیورسٹی" کا قیام تھا۔ اس خیال کو ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ "جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے"۔۶

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں علی گڑھ کالج کے یورپین اسٹاف کے خلاف طلبہ اور کالج کے بعض ٹرسٹی حضرات میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ کالج پر ان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا ہے اور وہ جس طرح چاہتے ہیں کالج کو انگریزی سامراج کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت مقامی اور بین الاقوامی سیاست، خصوصاً ممالک اسلامیہ میں عیسائی سامراجی طاقتوں کا دباؤ بہت بڑھ رہا تھا، پھر اس کے بعد طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے صورت حال بالکل بدل دی اور مسلمانوں میں، جن میں علی گڑھ کالج کے نئی نسل کے لوگ بھی پیش پیش تھے، انگریزی حکومت کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار ہوا، مولانا محمد علی کا کامریڈ اور ہمدرد، مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور دہلی میں نظارہ المعارف کا قیام جس میں شیخ الہندؒ کے ایما پر مولانا عبید اللہ سندھی بھی شریک تھے، اس رد عمل اور مسلمانوں میں عمومی حرکت کی علامت تھے۔ نواب وقار الملک نے بھی جو سرسید کی جماعت کے پہلے شخص تھے، ترکوں کی کھل کر حمایت اور سیاسی امور میں نوجوان مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان میں قومی و مذہبی احساس پیدا کیا، دوسری طرف مذہبی حلقے اور علما بھی نواب صاحب کی مذہبی زندگی اور اسلامی معاشرت کی وجہ سے کالج کی طرف توجہ کرنے لگے یہاں تک کہ جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کا خیر مقدم کیا، علما نے اس کی تائید کی اور مجلس ندوۃ العلما نے تو مالی اعانت سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بعد میں جامعہ اسلامیہ کی تجویز جب پیش کی گئی تو پوری مسلمان قوم نواب صاحب کی ہمنوا تھی اور ۱۹۱۳ء کے وسط تک صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ انگریز پرست عناصر اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرنے لگے تھے۔

پھر ۱۹۱۴ء میں جب عالمی جنگ چھڑ گئی اور احرار ملت نظر بند کر دیے گئے تو مسلم یونیور
فاؤنڈیشن کمیٹی کے ان ممبروں نے جو حکومت وقت کی تجویز کے ہمنوا تھے' اس کی کوشش کی
حکومت کی تجویز منظور کر لی جائے' لیکن اس کوشش میں کئی سال لگ گئے۔ ادھر علی
کے بہت سے بہی خواہوں کو جب یہ یقین ہوگیا کہ حکومت کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی
دے گی تو انہوں نے وقار الملک کی اسکیم کو عملی شکل دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس
میں ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اور ان کے ساتھی پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں یہ خبر عام تھی
"والی بھوپال کی سرپرستی میں عنقریب سلطانیہ کالج کے نام سے ایک آزاد دارالعلوم دہرہ دون
بننے والا ہے اور علی گڑھ کالج کے اکثر طلبہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس اب ہم ہوں گے
سلطانیہ کالج کی تعلیم اور سامراج دشمنی کی فضا"۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جامعہ
اسلامیہ کے قیام سے بہت پہلے مسلمانوں میں آزاد تعلیمی ادارہ کا تصور روز بروز مقبول ہو رہا تھا

جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ دنیائے اسلام پر ایک بڑی مصیبت ٹوٹ چکی ہے اور
ہندوستان میں عوام کی حالت دگرگوں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ممالک اسلامیہ میں یو
طاقتوں کی اور خاص طور پر برطانوی سامراج کی اسلام دشمنی کے رویے سے ایک ہلچل
ہوگئی۔ نتیجے میں خلافت تحریک شروع ہوئی اور علما نے جمعیتہ العلما کے نام سے اپنی
بنائی۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کے خلاف ترک موالات کا بگل بجا۔ اس تحریک میں علماء
برادران اور سارے احرار ملت پیش پیش تھے۔ جامعہ ملیہ کا قیام انہیں ہنگامہ خیز قومی و
تحریکات کا مرہون منت تھا۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیا
تخیل یکایک ذہنوں میں آگیا' بلکہ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے یہ درحقیقت نتیجہ تھا آزاد تعلیم
اس تخیل کا جو سرسید' سید محمود' اور وقار الملک کے ذہنوں میں تھا اور جسے برگ و بار لانے
اپنے وجود کو عملی زندگی میں مستحکم کرنے کا موقع فراہم کیا' مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک
سلسلے میں حریت پسند مسلمانوں اور حکومت وقت کے مابین اختلاف اور کشمکش نے اور پھر
میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں نے۔

اب اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے اس اہم افتتاحی خطبے کو یاد کرنا چاہیے
انہوں نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی مسجد کی دیوار کے سہارے بیٹھ
قوم کے حریت پسند اجتماع کے سامنے پیش کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے
غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور

خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیو بند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا"۔

شیخ الہندؒ نے یہ بات بھی کہی تھی کہ "بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں میں رکھی گئی تو اس دن علما نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا۔ تو کیا آپ ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو"۔

قدیم و جدید کا یہ ملاپ اور آزاد تعلیمی ادارے کا قیام اس گہرے احساس کا نتیجہ تھا جو تقریباً" پچاس سال تک تعلیمی مقاصد کی یک رخی کے سبب مسلمانان ہند میں پیدا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اگر اس لحاظ سے دیکھیے تو یہ انگریزی سامراج اور نصاریٰ کی سیاسی و ذہنی غلامی کے خلاف ایک ایسی تعلیمی تحریک تھی جس کا ایک مخصوص نصب العین تھا اور جس کو وطن عزیز کی سیاسی آزادی کے وقت تک، مختلف نشیب و فراز کے باوجود یہ اپنے سینے سے لگائے رہی اور اس کی اشاعت کرتی رہی۔ اس تعلیمی تحریک کی چند خصوصیات تھیں جنہیں اس کے وجود کے اولیں برسوں میں حکیم اجمل خان مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم اور دوسرے اکابر ملت نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا اس برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کا بنیادی منہاج اور مقصد، ان خصوصیات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا، ہاں کسی قدر زمانے اور علاقائی حالات کا خیال رکھنا ہوگا۔

حکیم صاحب مرحوم نے دسمبر ۱۹۲۱ء میں فرمایا تھا کہ جدید ملی تعلیم کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے "جو اپنے مذہب سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان پر سختی سے عامل بھی ہوں ——— جو جدید علوم سے واقف ہوں، لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرز زندگی کا، جو اپنی روزی کمانے میں بھی کسی کے دست نگر نہ ہوں اور ایک خود دار مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں اور اس لیے کہ پیکر ملت قرآن سے زندہ ہے" "ہم نے تعلیم قرآن کو اپنے نظام میں مرکزی حیثیت دی" اور تمام دیگر علوم جدیدہ کو قرآن اور اسلام کا خادم بنایا۔ تاریخ اسلام کی تعلیم اسی لیے ضروری قرار دی گئی کہ "نفس ملیہ" کا تواتر قائم رہے، اور مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ایک عظیم الشان تہذیب کے امانت دار ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ غیر زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ غیر فطری تھا اور اس سے سوائے اس کے کہ ملازمین و محکومین پیدا

ہوتے رہیں' طلبہ میں ذوق نشوونما اور ان کے اعمال میں اس کا اثر مفقود رہے اور پوری قوم کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں' ہم نے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" یعنی جدید نظام تعلیم میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا اور اس طرح ان تمام مکارانہ کوششوں سے اپنے کو مامون کر لیا جو سب سے ناواقفیت' تاریخ ملی سے بے خبری اور غیر زبان میں تعلیم حاصل کر کے معارف علمیہ سے بالکل نابلد رہنے کے باعث ہمیں ہمیشہ کے لیے مغرب کے تمدن مادی کی غلامی میں ڈال دیتی تھیں۔"۸

مولانا محمد علی نے جنوری ۱۹۲۸ء میں ہمدرد میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ جامعہ ملیہ ہے کیا؟ لکھا تھا کہ "ازکلید دیں در دنیا کشاد" جاننے والے جانتے ہیں کہ صدیوں پر پھیلی اسلامی معاشرہ کی پوری تاریخ اس بلیغ مصرعے کی تشریح اور وضاحت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہر مسلمان طالب علم کے لیے عربی زبان لازمی قرار دی گئی تھی' مسلمانوں کے جدید نظام تعلیم میں یہ ایک بڑا اہم اقدام تھا۔اللہ کی کتاب جو دین اسلام کی اساس ہے' عربی زبان میں ہے' عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک تہذیبی رشتے اور ایک "امت مسلمہ" کے احساس کی زنجیر میں جوڑے ہوئے ہے۔ ان دونوں امور کے پیش نظر' یہ فیصلہ بڑا تاریخ ساز تھا کہ جامعہ میں عربی زبان پر خاص توجہ دی جائے اور اسے ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی قرار دے کر تفسیر و حدیث اور عقائد و فقہ کی تعلیم کے ساتھ طلبہ میں براہ راست قرآن فہمی کا شوق پیدا کیا جائے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ عربی ادب میں نثر کا کورس قرآن کریم اور صرف قرآن کریم کو رکھا گیا تھا۔ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر آج تک دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں میں جہاں مقامی زبانیں عربی کے علاوہ کچھ اور تھیں یا ہیں عربی زبان ہی کے ذریعہ سے جو اسلامی ثقافت کی زبان رہی ہے' رشتہ اتحاد قائم رہا ہے اور آئندہ بھی یہی صورت رہے گی کیونکہ قرآن کی زبان عربی ہے۔

۱۹۲۷ء میں امیر جامعہ حکیم اجمل خان مرحوم نے اپنی آخری تحریر میں جسے انہوں نے ایک سپاس نامے کی شکل میں غازی امان اللہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا' تاکہ ان کے ذریعہ سے وہ تمام عالم اسلام کو اس تعلیمی تحریک یعنی جامعہ ملیہ کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرا دیں جو باتیں کہی تھیں مولانا محمد علی نے ۱۸ر جنوری ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "دینداری ہی کو صحیح دنیاداری سمجھنا اور دنیا کو صحیح طریقے پر برتنے ہی کو دین جاننا' (طلبہ کو) اسراف کی عالمگیر وبا سے بچانا' ان میں سادگی اور جفاکشی کی عادت و خصلت پیدا کرنا' پھر دستکاری سیکھنے پر اس قدر اصرار کرنا کہ انہیں اس قسم کی محنت سے عار نہ ہو اور اگر

دماغی قابلیت سے کسی وقت اکل حلال کی صورت نہ بھی نکل سکے تب بھی وہ قوت لایموت جائز طریقے پر حاصل کرنے سے محروم نہ رہیں"۔ جامعہ کی وہ دوسری خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہیں۔پھر جامعہ نے خدا پرستی ' ملت پروری اور وطن دوستی کو اس طرح بہم آمیز کیا ہے کہ ملک کی دوسری تعلیم گاہوں میں محبت و اخوت کے ایسے نمونے مشکل ہی سے ملیں گے جیسے کہ اس درس گاہ میں ڈھلتے ہیں۔

جامعہ کا ایک تہذیبی رول بھی تھا جسے شعوری طور پر نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کی گئی۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا ایک تہذیبی نصب العین ہے جو ان کے مذہب کے سائے میں ہر طرح کے یک رخے پن اور جمود سے بری ' نامی ' جامع اور مکمل ہے' اس لیے اسے ذہنی زندگی کے ہمہ جہتی تقاضوں اور وقت کی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیے۔ جامعہ نے اپنے تعلیمی مقاصد میں اس بات کا لحاظ رکھا تھا کہ اس کے مسلمان طلبہ اسلامی تمدن کو اپنی شخصی و ملی زندگی کی بنیاد بنائیں 'لیکن وہ مغربی تہذیب سے جو رفتہ رفتہ عالمی تہذیب بنتی جا رہی ہے اور ہندستان کی قومی تہذیب سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھیں ' اسی طرح کہ ان کے ملی تشخص پر کوئی آنچ نہ آئے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں انہیں اسی طرح کے تمدنی مسائل پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمدنی نصب العین کی ماہیت کے فریم ورک میں تعلیمی نصب العین متعین کریں۔ جامعہ ملیہ نے اپنے نظریہ تعلیم اور عملی تعلیم سے اس سلسلے میں کچھ رہنمائی کی تھی ' درحقیقت یہ خاصا بڑا چیلنج تھا جو اس برصغیر میں اس زمانے میں مسلمانوں کے سامنے تھا'یہ چیلنج آج بھی موجود ہے جس کا جواب مسلمان تعقل ' تفکر اور تفقہ سے کام لے کر ایک مثبت' فعال اور جامع تعلیمی دستور العمل کے ذریعہ سے دے سکتے ہیں۔

جامعہ ملیہ نے ایک کام اور کیا ہے اور وہ ہے تحقیقات علمی اور اشاعت علوم کا کام۔اس کام کو اگرچہ وہ وسیع پیمانے پر نہیں کر سکے ' لیکن اس نے اس کی اہمیت کو سمجھا ' اس طرف توجہ دلائی ' اور یاد دلایا کہ اسلامی تہذیب کا یہ اتنا بڑا کارنامہ رہا ہے کہ دنیا اس بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ہمارے قدیم نظام تعلیم میں بہرحال اس کی گنجائش تھی' لیکن علی گڑھ کالج میں جو نظام تعلیم رائج ہوا وہ اس سے عاری تھا اور اگر اس وقت وہاں تحقیقات علمی کے جو چند محرم راز موجود تھے وہ قدیم تعلیم ہی کے پروردہ و پرداختہ تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس جمود کو توڑا اور اپنا مطبع قائم کر کے تحقیقات علمی کے شوق کو مہمیز لگائی۔بعد میں اس کے اساتذہ نے تصنیف و تالیف اور تراجم کے ذریعہ سے اس کام کو خاصا آگے بڑھایا اور حق جوئی

اور علم طلبی کی صحت مند روایات قائم کیں۔

لیکن تمدنی مسائل کا شعور اور تحقیقات علمی کا شوق' یہ دونوں چیزیں اعلیٰ تعلیم کی سطح سے تعلق رکھتی ہیں ' جامعہ کے وسائل جب بہت محدود ہوگئے اور اعلیٰ تعلیم کی توسیع ممکن نہیں رہی بلکہ اس کا کام سمٹنے لگا تو اس نے تعلیم کی ابتدائی اور ثانوی منزلوں کی طرف توجہ کی کہ طالب علم کو اعلیٰ تعلیم اس وقت ملتی ہے جب اس کی سیرت بن چکی ہو اور پختہ رہ چکی ہو۔ یہ ممکن تھا کہ جامعہ کی بے سروسامانی نہ بڑھتی تو بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ اس طرح مرکوز نہ ہوتی جس طرح ۱۹۲۸ء کے بعد ہوئی جب حکیم اجمل خان مرحوم کا انتقال ہوا۔ تعلیم میں تربیت اور تہذیب نفس کی جو قوتیں ہیں ان کے ظاہر ہونے اور نشوونما پانے کا خاص وقت اسکول کی تعلیم کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کے لیے اسکول کی جماعتیں اور دارالاقامے یا گھر خاص مواقع ہوتے ہیں۔ جامعہ ملیہ نے بچوں کی تعلیم کو ایک ایسی تعلیمی تحریک بنا دیا اور ایسے ایسے تعلیمی تجربے کیے کہ ہندوستان کے اسکولوں میں اس وقت تک شاید ہی کہیں کیے گئے ہوں گے۔ اس کام میں ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے ماہر تعلیم کی رہنمائی جامعہ کو حاصل تھی۔ انہوں نے جرمنی میں جو کچھ دیکھا تھا اس سے بہت اثر لیا تھا۔ انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ مسلمانوں کے لیے ملک بھر میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایسا نظام نہ تھا جس میں تعلیم کا جدید طریقوں پر کام کیا جاتا ہو۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے طے کیا کہ وہ پہلے اس میدان میں تجربے کریں اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کو اس حد تک محدود رکھیں کہ اس کی بدولت انہیں اپنی ضرورت کے مطابق اچھے کام کرنے والے مل سکیں۔ اس میں بڑی کامیابی ہوئی اور اس کام کی ضرورت اور افادیت کی وجہ سے قوم نے اس کو پسند کیا اور جامعہ کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہوا کہ اس نے ایک تجرباتی تعلیمی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ مکتبہ جامعہ نے (پیام تعلیم) اور اپنے اشاعتی پروگرام کے ذریعہ بچوں کے لیے معیاری لٹریچر فراہم کیا اور اس طرح بچے جن کی تعلیمی ضرورتیں عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی تھی' قوم کی امانت قرار پائے اور ان کے مستقبل کو قوم کا مستقبل قرار دیا جانے لگا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم گاہوں کو کبھی فلسفی کا اونچا مینار نہیں سمجھا ' اس نے اس پر زور دیا کہ علم کی روشنی اور تعلیم کی برکتیں اگر دوسروں تک نہیں پہنچتیں اور معاشرے کا گوشہ گوشہ اس سے منور نہیں ہو جاتا تو ایسے علم اور ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ! تعلیم کا کام ایک پیغمبرانہ کام ہے اور اسے ایک تبلیغی جوش ولولے سے کرنا چاہیے۔ تعلیم سے متعلق اس نظریے کا نتیجہ تھا کہ جامعہ نے تعلیم بالغاں اور سماجی خدمت کی تحریک چلائی' جس سے ملک و ملت

دونوں کو روشنی ملی' جامعہ کا یہ تعلیمی کام ایک مجتہدانہ کام تھا' اور یہ کام اس وقت تک کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایسے منصوبہ بند طریقے پر نہیں کیا گیا تھا۔

جامعہ اس بات سے خوب واقف تھی کہ تعلیمی تجربے اور ترقی کے منصوبے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اگر قوم کی معنوی روح اور ذہنی قوت جامد ہو کر رہ جائے' اس لیے قومی زندگی کا کوئی متحدہ مقصد ہونا چاہیے' اور "تعلیم کا پہلا مقصد" بقول سید سلیمان ندوی مرحوم " یہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے"۔۹۔ بے مقصد تعلیم زندگی کو بے مقصد بنا دیتی ہے اور اس سے قوم کی معنوی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں وطنیت کا جو تصور ہے وہ یقیناً" کبھی کبھی ایسے اعمال و واقعات کا سبب بن جاتا ہے جن سے انسانیت اور خدا ترسی کا جذبہ پناہ مانگتا ہے۔ اسلام کا مزاج اس وطنیت کے تصور سے ابا کرتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے عقل و خرد کی گستاخیوں سے مذہب کا وہ پہلو ابا کرتا ہے جہاں صرف عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ضروری ہے اسی طرح اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق کی بھی ضرورت ہے۔

آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اسکولوں ' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انہیں مضامین کے پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے' یعنی ہماری درس گاہوں میں اب صرف نوشت و خواند کا حرفہ پیشہ سیکھنے کے لیے طلبہ داخل ہوتے ہیں جو اعلیٰ سطح پر بھی کسی پیشے ہی کی تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ' یہ بات بذات خود کچھ ایسی بری نہیں ' لیکن اس سے علوم انسانی اور سماجی علوم کی جس طرح بے آبروئی ہوئی ہے اور نظام تعلیم معنوی اعتبار سے جس عدم توازن کا شکار ہوا ہے' اس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہماری جامعات اور نچلی سطح کی ہماری درس گاہوں سے زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش نہیں ہو رہی ہے اور اس صورت حال کے خوفناک نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے اس نظام کو بدلیں اور مکتب سے لے کر جامعات تک تعلیم کا ایسا نظام بنائیں جس سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے چشمے پھوٹیں اور حیات ملی کے اسرار کھلیں۔

ہمارا خیال ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی تحریک میں ایسے حیات پرور عناصر موجود تھے جن کی مدد سے مسلمان آج بھی اپنی قومی و ملی ضروریات کے لحاظ سے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دے سکتے ہیں جو ہر لحاظ سے ایک ایسا نظام سے متوازن' مفید اور جامع ہوگا اور جس سے دین اور دنیا دونوں کے تقاضے پورے ہوں گے۔

حوالے

۱۔ "وقار الملک اور جامعہ اسلامیہ" ' ماہنامہ جامعہ' ستمبر ۱۹۳۶ء ۔ یہ مضمون وقار الملک کے ایک قلمی مسودہ سے جامعہ میں نقل کیا گیا تھا جسے انہوں نے دہرہ دون میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اسی موقع پر تحریر فرمایا تھا جب سکریٹری اوف اسٹیٹ نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سے متعلق الحاق وغیرہ کے خلاف قطعی فیصلہ دیدیا تھا۔

۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ایضاً"

۶۔ اکرام اللہ ندوی' وقار حیات' مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۰ء' صفحات ۶۲ ۔ ۵۶۱

۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ مختصر تاریخ اور دستور العمل' جامعہ ملیہ' دہلی' ۱۹۶۴ء' صفحہ ۱۹۔

۸۔ حکیم محمد اجمل خاں' خطبہ صدارت (جو جامعہ اسلامیہ کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۷ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں پڑھا گیا)' مطبع ملیہ' علی گڑھ' ۱۹۲۱ء' صفحات ۱۷ ۔ ۱۵

۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی' مسلمانوں کی آئندہ تعلیم' مکتبہ جامعہ' صفحہ ۸

(ماخوذ از مقالات مذاکرہ ملی (ہمدرد)